التقریظ والانتقاد

مذہب اور سائنس

مذہب اور سائنس از مولانا عبدالباری ندوی تقطیع کلاں ضخامت ۲۹۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۰/۵ پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ - لکھنؤ۔

یورپ کی موجودہ علمی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جب وہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی نے انسانوں کی قدیم بزم فکر و خیال کو درہم برہم کیا تو مذہب و فلسفہ کی سرزمین میں گویا زلزلہ آگیا۔ اور ایک طرف پادری صاحبان اور دوسری جانب فلاسفہ دونوں.. سائنس کا چیلنج قبول کرنے کی غرض سے نقد و جرح کے میدان میں آکھڑے ہوئے۔ علاوہ ازیں دنیا میں کوئی علمی نظریہ بھی جامد نہیں ہوتا۔ بلکہ تجربہ و مشاہدہ اور علم میں ترقی کے ساتھ اس میں بھی تغیر و تبدل اور اضافہ و ترمیم ہوتا رہتا ہے چنانچہ سائنس کے نظریات میں بھی گذشتہ ایک صدی میں نہایت اہم اور دور رس تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اس صورت حال نے مذہب اور فلسفہ کے مرد میدان مجاہدوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ چنانچہ جہاں ایک طرف سائنس برق رفتاری کے ساتھ ترقی کرتی اور آگے بڑھتی رہی دوسری جانب سائنس پر تنقید کا بادہ سر جوش بھی تیز تر ہوتا چلا گیا۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ آج انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں سائنس پر تنقید کا ایک نہایت عظیم ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ اور کوئی دن نہیں جاتا جب کہ اس میں اضافہ نہ ہوتا ہو۔

سائنس نے جاہلیہ العلیا کی افکار و آراء اور مسائل میں اور خلق و تقدیر میں جو ہیجان عظیم پیدا کیا تھا اس کے اثرات عالمگیر تھے۔ چنانچہ اسلام بھی ان سے متاثر ہوا اور برصغیر ہند

و پاکستان کے مسلمانوں پر بھی اس کا شدید ردِ عمل ہوا۔ لیکن یورپ میں اور ہم میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ یورپ کے علماء نے مذہب اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علومِ جدیدہ اور سائنس سے بھی پورے طور پر باخبر اور آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں کا مذہبی طبقہ نہ مغرب کی کسی زبان سے آشنا ہوتا ہے اور نہ علوم جدیدہ سے واقف! اس فرق کے باعث یورپ کے مذہبی علماء سائنس اور اس کے کسی نظریہ پر تنقید کرتے ہیں تو اس میں وزن ہوتا ہے۔ جان ہوتی ہے اور سنجیدہ دماغوں پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے علماء جو باتیں کہتے ہیں وہ محض ہوائی اور جذباتی ہوتی ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں کے لیے سامانِ تفریح سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ اس بنا پر مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا یہ جذبہ و ولولہ اور حوصلہ و ہمت لائقِ تحسین و ستائش ہے کہ موصوف فلسفۂ جدید کے نامور استاد اور مصنف تو پہلے سے تھے ہی۔ اب اس ضعیفی اور پیری میں سائنس پر تنقید اور اس کی تاریخِ ارتقا کا مطالعہ بھی وسعت و گہرائی سے کر بیٹھے اور سالہا سال کے مطالعہ و غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد زیرِ تبصرہ کتاب لکھی۔ کتاب کے نام سے ذہن کا انتقال اس طرف ہوتا ہے کہ اس میں سائنس اور مذہب کے بعض مشترکہ مسائل و مباحث پر گفتگو ہوگی، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ دماغوں پر سائنس کی جو مرعوبیت چھائی ہوئی ہے جس کے باعث مذہب اور اخلاق اور روحانیت کے معاملات میں بھی اس کے فیصلے کو حرفِ ناطق مانا جانے لگا ہے۔ اس مرعوبیت کو دور کرنا کتاب کا بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ شروع میں مولانا نے اس پر بحث کی ہے کہ آدمیت دراصل ہے کیا؟ اس سوال کے جواب میں بتایا گیا ہے کہ انسانیت ہمہ سعی و تلاش اور ہمہ جستجو ہے، یہ جستجو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے کیونکہ کسی حقیقت کے چہرے سے اگر ایک پردہ اٹھتا ہے تو اس جیسے ہزاروں اور پردے سامنے آجاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عالمِ غیب کی پردہ کشائی کے سلسلہ میں سائنس اب تک جو کچھ کر سکی ہے کیا وہ انسان کے اس ذوقِ طلب و جستجو کی تسکین کے لیے کافی ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ کیونکہ سائنس کی گزشتہ تین سو برس کی تاریخ بتاتی ہے کہ ٹکنالوجی کے میدان میں اس اندھیرے

انگیز ترقی و پیش رفت کے باوصف کائنات کی تخلیق اور اس کی تشکیل و تعمیر کے باب میں نظریاتی طور پر اب تک سائنس کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکی ہے جس کو حرفِ آخر کہا جاسکے چنانچہ اس کی گزشتہ تاریخ افکار و نظریات میں تغیر و تبدل کی تاریخ ہے۔ اس سلسلہ میں بنیادی اور نہایت اہم تغیرات و تبدلات کیا ہیں؟ کتاب کا بڑا حصہ اسی ایک سوال کے جواب پر مشتمل ہے۔ ان اہم تغیرات کو برصغیر ہند و پاک کے مشہور ماہر ریاضیات و سائنس ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی پاکستان جنہوں نے اس کتاب کا مبسوط و مفصل اور بڑا فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔ خود ان کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں۔

"علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانے میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں۔ اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ مادہ اور توانائی۔ ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت و معلول جیسے بنیادی تصورات ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسویل کی طبیعیات کے بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے" (ص ۲۷)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وضاحت سے بتایا کہ انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصور تھے۔ مادہ کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مجسم شے ہے جو ایک محدود فضا کو بلا شرکت غیرے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور جس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے جس کو کم و بیش یا معدوم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلق یہ خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی مجسم شے ہے اور نہ کسی محدود فضا کو بلا شرکت غیرے گھیرتی ہے لیکن جدید طبیعیات میں مادہ اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہو گیا ہے۔ اور تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے

کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں یعنی مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور کبھی توانائی مادہ میں کسی مادی شے کی کمیت مستقل نہیں بلکہ اس کی حرکت پر منحصر ہوتی ہے اور رفتار کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اسی طرح ایٹم (جوہر) کے متعلق ۱۸۹۵ء تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادہ کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس کے بعد پتہ چلا کہ ہر ایٹم کے اندر بہت سے اور چھوٹے چھوٹے ذرے ہوتے ہیں جن کو الکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کہتے ہیں۔ کسی ایٹم کا مادہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ذرہ اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ترتیب دیئے ہوئے ہوتے اور چند معینہ مداروں پر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ایٹم کے مختلف ذروں کے درمیان اسی طرح وسیع خلا ہوتا ہے جیسے سورج اور اس کے سیاروں کے درمیان۔ کیمیائی عنصر سے متعلق سابقہ تصور یہ ہے کہ وہ ایک خاص قسم کے مادہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ان کی ہیئت اور ماہیت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے جیسے ہائیڈروجن، آکسیجن یا سوڈیم وغیرہ۔ چند برس پہلے تک یہ خیال تھا کہ ایسے کیمیائی عناصر کی تعداد بانوے ۹۲ ہے۔ اور ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا محال ہے۔ لیکن آج کل یہ کیمیاگری تجربہ خانہ میں ہر وقت کی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں تجربہ خانہ میں نئے عناصر بھی بنائے جا رہے ہیں اور گزشتہ تیس برسوں میں یورینیم کے علاوہ تقریباً پندرہ نئے عنصر اور بنائے جا چکے ہیں۔ زمان و مکان کے تصور کا مرحلہ بھی نہایت اہم ہے اس کی روداد بھی سن لیجیے۔ ۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن نے نظریاتی اور تجرباتی دونوں قسم کے وجوہات کی بنا پر اعلان کیا کہ مطلق زمان اور مطلق مکان کا تصور جس کو نیوٹن اور اس سے قبل فلاسفہ اور حکما نے پیش کیا تھا۔ اب قابل قبول نہیں رہا۔ آئن سٹائن نے مسلسل تجربات کے بعد دعویٰ کیا کہ زمان یعنی وقت کوئی مطلق شے نہیں بلکہ اضافی ہے یعنی مثلاً زید کے لیے جو واقعات ہم وقت ہوں ضروری نہیں کہ بکر کے لیے بھی وہ ہم وقت ہوں۔ بلکہ یکے بعد دیگرے ہو سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وقت کے بہاؤ کی شرح کا بھی ان دونوں کے لیے یکساں ہونا ضروری نہیں ہے۔ زمان کی مانند مکان یعنی فضا بھی مطلق نہیں۔ بلکہ اضافی ہے۔ کیونکہ دو متحرک اشیاء

کے درمیان فاصلہ کے کوئی معنی نہیں جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کس خاص وقت کے لیے یہ فاصلہ ناپا جارہا ہے. اور کونسا مشاہد اس فاصلہ کو ناپ رہا ہے اب چونکہ وقت خود اضافی ہے اس لیے فاصلہ جو وقت پر منحصر ہے. لازماً اضافی ہوگا . اسی بنا پر نظریۂ اضافت کی رو سے زمان و مکان مطلق اور ایک دوسرے سے آزاد نہیں بلکہ اضافی اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں. اور کائنات میں دو مختلف چیزیں مکان اور زمان نہیں. بلکہ ایک ہی شے "مکان۔ زمان" پائی جاتی ہے. اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انیسویں صدی تک دنیا کا جو سہ ابعادی تصور رائج تھا. اس کے بجائے اب چار ابعاد (DIMANTIONS) تسلیم کر لیے گئے ہیں.

علاوہ ازیں نیوٹن نے قوت کو بھی مطلق تصور کیا تھا. لیکن آئن سٹائن نے نظریۂ اضافیت کو اور وسعت دے کر ثابت کیا کہ زمان۔ مکان اور کمیت کی طرح قوت بھی اضافی مفہوم ہے بلکہ اور آگے بڑھ کر بتایا کہ قوت کا علیحدہ تصور ہی بیکار ہے. مختلف تجربات اور مشاہدات کے بعد آئن سٹائن نے کہا کہ ہم جس چیز کو قوت کہتے ہیں وہ کوئی الگ اور مستقل بالذات چیز نہیں. بلکہ صرف مکان۔زمان کی ہی ایک خاصیت ہے. نظریۂ اضافیت کے انکشاف سے قبل خیال کیا جاتا تھا. کہ فضا لامحدود ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں. لیکن آئن شائن نے بتایا کہ کائنات متناہی ہے. اور اس کے دو نقطوں کے درمیان کا فاصلہ متعین ہے. لیکن چونکہ کائنات کرہ یا گولہ کی شکل کی ہے اس لیے اس پر کہیں کوئی حد یا کنارہ نہیں ہے اور جب تک چاہیں اس کے گرد سفر کر سکتے ہیں. زمان و مکان، مادہ اور توانائی. عنصر اور قوت جیسے بنیادی تصورات کے بدلنے کی وجہ سے علت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آگیا ہے. نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعین ہو جائے گی. میکانکس کا یہ مسئلہ تھا. جو مادہ پرستوں کے لیے حکم فیصل کا کام دیتا ہے. اور جس کی بنا پر وہ کسی خالق کائنات کے تصور کو غیر ضروری قرار دیتے تھے. لیکن کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں کی بنیاد پر پروفیسر

ہائی زن برگ نے ۱۹۲۷ء میں یہ بتایا کہ مظاہر فطرت میں تعین یا جبر نہیں۔ بلکہ عدم تعین۔ جاری و ساری ہے۔ اس کے بعد سے طبعی سائنس کا مروّجہ اور مسلّمہ قانون یہ ہے کہ نہ صرف کائنات بلکہ اس کے کسی حصہ یہاں تک کہ کسی ایک ذرہ کا مستقبل بھی قطعی طور پر متعین نہیں ہے اس طرح قوانین قدرت تعینی (DETERMINISTIC) نہیں۔ بلکہ اوسطی یعنی (STATISTIAL) ہو جاتے ہیں۔

سائنس کی دنیا نے فکر و خیال میں ان اہم اور بنیادی انقلابات کا تذکرہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔ دراصل ہائی زن برگ کے اصول عدم تعین PRINCIPAL OF INDETERMINACY کے انکشاف سے قبل ہی بعض مشہور سائنس داں اس امر کا اعتراف کر رہے تھے کہ سائنس کے طریقوں سے اشیا اور مظاہر کی انتہائی حقیقت یا غایت کو نہ تو دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ یہ چیزیں سائنس کے دائرہ عمل میں آتی ہیں ۲۳-۱۹۲۲ء کے بعد جب نیلس بوہر (NEILS BOHR) کے کوانٹم نظریہ میں یکے بعد دیگرے متعدد غلطیاں اور خامیاں منکشف ہونے لگیں تو ۲۶-۱۹۲۵ء میں نئی کوانٹم میکانکس کی بنیاد رکھتے ہوئے ہائی زن برگ اور ڈیراک نے بتایا کہ یہ غلطیاں اسی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ سائنس کا مقصد اور اس کا طریق کار صحیح طور پر متعین نہیں کیا گیا۔ سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی اصلی اور آخری ماہیت اور حقیقت معلوم کرے۔ بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیا اور مظاہر میں — باہمی ربط اور تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر کہا کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ "برق کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟ بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوت برق کا عمل کیا ہے (ص ۵۹)

آخر میں اس سلسلہ کی سب سے اہم اور اساسی بات بھی خود ڈاکٹر صاحب کی زبانِ قلم سے سُن لیجیے۔

"آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ سائنس کے اساسی تصور میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما

ہوا۔ یہ انقلاب سائنس کے بنیادی قوانین کی تشکیل سے متعلق ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے انیسویں صدی کے ختم تک سائنس کے بنیادی قوانین استقرائی (INDUCTIVE) نوعیت کے تھے۔ مثلاً قانون تجاذب کو ہی لے لیجئے۔ یہ قانون خاص مثالوں کی مدد سے اخذ کیا گیا تھا۔ اسی طرح برق و مقناطیس کے قوانین یا روشنی کے منعکس یا منعطف یا منتشر ہونے کے قوانین سب استقرائی تھے۔ لیکن ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۵ء میں آئن اسٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت کی تشکیل کے لیے جو قانون یا مفروضے (POSTULATES) اختیار کیے وہ استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی (EPISTEMOLOGICAL) یعنی فلسفیانہ نوعیت کے ہیں۔ چنانچہ یہ مفروضے جن پر نظریہ اضافیت کی تشکیل کی گئی ہے۔ استقرائی نہیں۔ بلکہ علمیاتی ہیں۔ اسی طرح ہائزن برگ کا عدم تعین کا اصول جس پر جدید کوانٹم میکانکس کا دار و مدار ہے۔ استقرائی نہیں۔ بلکہ علمیاتی ہے۔ پروفیسر ایڈنگٹن نے سائنس کی اس نئی تحریک کو ایک بڑی دلچسپ مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں فرض کرو ایک سائنسداں کسی تالاب سے ایک جال کے ذریعہ مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ جب تمام دن کی محنت کے بعد وہ ان مچھلیوں کو جو پکڑی گئی ہیں ناپتا ہے تو بزعم خود ایک قانون کا انکشاف کرتا ہے کہ اس تالاب میں کوئی مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔ اس کے اس فعل کو جب کوئی دوسرا دیکھتا ہے تو اس کو بتاتا ہے۔ تمکو اس قانون کو اخذ کرنے کے لیے تمام دن اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم محض اپنے جال کو دیکھ کر جس کے تمام خانے ایک انچ طول کے ہیں۔ شروع میں ہی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے۔ کہ اس جال سے کوئی ایسی مچھلی نہیں پکڑی جا سکتی۔ جس کا طول ایک انچ سے کم ہو۔ بہرحال سائنس میں اس نئی تحریک کا مطلب یہ ہوا کہ قوانین فطرت کی تشکیل کے لیے علم کی نوعیت اور علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر کے استقرائی قوانین کی بہ نسبت زیادہ دور رس اور دیرپا قوانین بنائے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ استقرائی قانون تو ایک بھی مخالف مثال کی بنا پر غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ نیوٹن کا قانون تجاذب ہے اس کو اس لیے مسترد

کرنا پڑا ۔ کہ اس قانون کی بنا پر سیارہ عطارد کا جو مدار محسوب کیا جاتا ہے وہ مشاہدہ کیئے ہوئے مدار کے مقابلہ میں غلط ہے ۔

ایک مشہور سائنسداں کے قلم سے طبیعی علوم کی ترقیوں اور سائنس کے افکار و نظریات میں اہم رد و بدل کی جو مختصر روئداد مذکورۂ بالا سطور میں بیان ہوئی ہے ۔ اس کو متن سمجھنا چاہیئے مولانا کی کتاب اسی متن کی شرح ہے لیکن یہ شرح فنی اور ٹکنیکل نہیں ہے ۔ اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ موصوف سائنس کے طالب علم کبھی نہیں رہے ۔ بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے ۔ کہ اوپر سائنس میں جس تغیر و تبدل کا ذکر ہوا ہے ۔ مولانا انہیں کا تذکرہ اکابر سائنس و فلسفہ مثلاً آئن سٹائن ہائی زن برگ سر جیمز جینیس سر آرتھر ر یڈنگٹن ۔ فلپ فرانک برکلے ۔ برٹرنڈرسل وغیرہم کی زبان سے مع ان کے مکمل حوالوں کے سناتے چلے گئے ہیں ۔ اور آخر میں مولانا نے بتایا ہے کہ جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انہوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ۔ وہ ٹوٹ گیا اور کم از کم ایک آفاقی ذہن (UNIVERSAL MIND) کا تسلیم کرنا ناگزیر ہوگیا تو اب کائنات کی حقیقت پر غور و فکر کرنے والوں کے لیے خدا کی ہستی پر ایمان لانے کی نئی راہیں کھل گئیں ۔ چنانچہ مولانا نے گفتگو اس پر ختم کی ہے ۔ یہ آفاقی ذہن کیا ہے ؟ کیسا ہے ؟ اور اس کے صفات کیا ہیں ؟ ان سب سوالات کا جواب قرآن ہی دے سکتا ہے جو منزل من اللہ ہے ۔ اور ہر قسم کی تحریف و تبدیلی سے یکسر محفوظ و مامون ہے اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ کتاب بڑی مفید، فکر انگیز اور معلومات افزا ہے اور بقول فاضل مقدمہ نگار کے ان اصحاب کے لیے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہو کر ایمان کی کمزوری کا شکار ہو رہے ہیں ۔ یقین محکم حاصل کرنے اور دنیا و آخرت میں نجات پانے کا سامان ہے لیکن تبصرہ نگار اپنے فرض میں کوتاہی کریگا ۔ اگر فاضل مصنف کی توجہ امور ذیل کی طرف منعطف نہ کرائے ۔

(۱) سائنس میں جو تغیرات ہوئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ علت و معلول کا تصور بھی

بدلا ہے۔ چنانچہ اسی بات کو ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب اپنی محتاط اور علمی زبان میں اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

"زمان و مکان، مادہ اور توانائی، عنصر اور قوت جیسے بنیادی تصورات بدلنے کی وجہ سے علت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آگیا ہے۔" (ص ۴۳)

لیکن مولانا اسی بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"لیجیے عقل و فلسفہ کی دنیا میں علت و معلول کا جو قانون ازلی اور ابدی حیثیت سے مسلم چلا آرہا تھا بیسویں صدی کی سائنس نے اس کا بھی بخیہ ادھیڑ دیا۔" (ص ۲۹) آگے چل کر اس سلسلہ میں فرماتے ہیں اور اس حد تک (کلی و قطعی علیت کو) خیرباد کہہ دینا پڑا کہ بعض وجال سائنس خصوصاً ریڈنگٹن جیسی مسلمہ شخصیت کا زیادہ زور اسی پہ ہے کہ قانون علیت ختم ہوچکا ہے اور اب اس کو ترک ہی کردینا چاہیئے۔" (ص ۱۱۱)

گزارش یہ ہے کہ قرآن مجید کی جابجا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا یہ پورا نظام نہایت مربوط، منظم اور مرتب ہے اس میں کہیں کوئی رخنہ اور بے ترتیبی نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بے شبہ یہ سب کچھ صانع عالم کی تخلیق ہے۔ اور اس لیے اس کے وجود اور اس کی صفات پر دال ہے لیکن جو کچھ بنا ہے وہ نہایت نظم اور ترتیب سے بنا ہے۔ اس بنا پر اشیاء میں علت و معلول کی نسبت کا ہونا ناگزیر ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے۔ کہ دو چیزوں میں علت و معلول کا جو رشتہ ہے۔ اس کا علم کلی انسان کے لیے حاصل ہونا ضروری نہیں چنانچہ سائنس بھی اس سے ابتک عاجز ہے۔ اس بنا پر اسے قدم قدم پر دھوکہ ہوتا ہے۔ آج جس چیز کو وہ کسی کے لیے علت قرار دیتی ہے کل معلوم ہوتا ہے کہ وہ علت ہی نہیں تھی یا تھی! لیکن اس کی علت کی بنیاد وہ چیزیں نہیں تھیں جن کو اب تک وہ علیت کی بنیاد سمجھتی رہی تھی۔ یا سرے سے سائنس نے علیت اور علت کا جو مفہوم اپنے ذہن میں قائم کر رکھا تھا وہ ہی غلط تھا۔ بہرحال قرآن مجید کی تصریحات کی روشنی میں ہمارے نزدیک صحیح تعبیر بیان وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے اختیار کی ہے یعنی یہ کہ علت و

معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آگیا ہے۔ مولانا کے الفاظ سے دھوکہ ہوتا ہے کہ اب علت و معلول کا قصہ ہی ختم ہوگیا۔ یہ چیز خالق کائنات کے کمالِ صناعی اور قرآن مجید کے بیان کے خلاف ہے۔

(۲) مادہ اور مادیت کا جب طلسم ٹوٹا تو سائنس نے تصوریت کے دامن میں پناہ لی۔ اور یہ تسلیم کیا کہ عالم میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف ایک آفاقی ذہن ہے۔ اور اس طرح ذہن سے باہر کسی شے کا وجود خارجی ہے ہی نہیں چنانچہ مولانا اس سلسلہ میں علمائے سائنس کے بیانات نقل کرکے لکھتے ہیں۔

"مطلب یہ کہ صورت شکل، روپ، رنگ، طول و عرض، اور سختی وغیرہ کے جس مجموعہ کو ہم عام بول چال میں چیز کہتے ہیں۔ اور جانتے ہیں۔ ایسی کسی چیز کا خود ہمارے ذہن سے باہر سائنسی طور پر قطعاً کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہی حال زمین سے آسمان تک کی دوسری ساری موجودات کا ہے۔ جن سے دن رات ہم اپنی زندگی میں دوچار رہتے ہیں" (ص ۱۷۹)

مولانا نے سائنس کے اس انکشاف کا بڑی فراخدلی سے خیرمقدم کیا ہے۔ حالانکہ اگر یہ صحیح ہے تو یہ وہی بات ہوئی جسے وحدت الوجود والے کہتے ہیں۔ اور جس سے عبد و معبود، خالق و مخلوق کا فرق اور مذہب کے احکام و مسائل اور اس کی تعلیمات کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کے لفظوں سے بھی مترشح ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ سائنس کے نزدیک پہلے سب کچھ مادہ ہی مادہ تھا۔ اس عالم میں کارفرمائی اور کارگزاری اسی کی تھی لیکن اب یہ پردہ درمیان سے اٹھا تو نظر آیا کہ اب تک جو کچھ سمجھا تھا غلط تھا۔ بلکہ درحقیقت ایک آفاقی ذہن ہے۔ جو کائنات میں کارفرما ہے اور یہ عالم ارض و سما اسی کی ہی صناعی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ہر شے کا وجود دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وجود ذہنی اور دوسرا وجود خارجی۔ اور کسی شے پر بحیثیت نرم و سخت اور سیاہ و سفید وغیرہ ہونے کے جو احکام لگتے ہیں وہ اس کے وجود خارجی پر ہی لگتے ہیں۔ سائنس اگر ترقی کے اس عظیم دور میں لاادریہ، یا عندیہ اور عنادیہ

فرقوں کی سطح پر اتر آئی ہے۔ تو پھر کوئی بتائے کہ جہل اور علم میں اب حد فاصل کیا ہے ؟

۳، مولانا نے بعض مقامات پر علمائے سائنس یا سائنس کے بعض نظریات کی نسبت استہزا اور تمسخر کی جو زبان استعمال کی ہے۔ وہ ایک علمی کتاب کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ اگر یہی انداز دوسرے لوگ ہمارے مذہب اور اس کے علماء کی نسبت استعمال کریں تو ہم کس منہ سے اس کی شکایت کر سکتے ہیں ! اور یوں بھی یہ طرز قرآن مجید کا حکم "ولاتنابزوا بالالقاب" کے خلاف ہے۔

۴، کتاب میں تکرار مضامین اس درجہ ہے کہ خدا کی پناہ ! ایک ہی بات کو بار بار پڑھتے ہوئے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

۵، ہمیں معلوم ہے کہ مولانا صرف فلسفی نہیں بلکہ اردو زبان کے بلند پایہ ادیب اور شگفتہ قلم بھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ جب سے انھوں نے تفلسف سے رشتہ جوڑا ہے ان کا طرز نگارش بھی بالکل بدل گیا ہے۔ شگفتگی بیان کی جگہ غیر ضروری طوالت، کثرت مرادفات اور ژولیدہ بیانی نے لے لی ہے اور یہ اردو زبان کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے۔ اس جدید طرز بیان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مولانا ایک ہی لفظ کی تکرار بے موقع اور بے محل کرنے لگے ہیں مثلاً اگر لکھنا یہ ہو کہ "زید نے پانی پیا" تو مولانا اس طرح لکھیں گے "زید نے پانی ہی پانی پیا" یا۔ "زید نے پانی پیا ہی پیا" مولانا خود فرمائیں۔ یہ کون سا اسلوب بلاغت و انشاء ہے۔ یہاں ایک واقعہ یاد آگیا۔ راقم الحروف کو مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ میں ان کے غیر معمولی شفقت بزرگانہ کے باعث جو بے تکلفی حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے ایک دن عرض کیا۔

"مولانا ! اگر آپ اپنے طرز تحریر کی اصلاح کرلیں تو اس کی افادیت صد چند ہوجائے اب تو حال یہ ہے کہ میرا ایسا آپ کا معتقد بھی آپ کی کوئی تحریر ابتداء تا آخر دلچسپی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا،" مولانا نے یہ سنکر اپنے خاص انداز میں فرمایا۔

۔ میاں! تم لوگ شبلوی اندازِ تحریر کے مارے ہوئے ہو۔ میں اس اندازِ نگارش کو نیچری کہتا ہوں۔ مولویانہ طرزِ تحریر وہی ہے جو میرا ہے۔" مولانا کے اس ارشاد کے بعد مزید کچھ عرض کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ میں اور مفتی صاحب (مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی) ایک قہقہہ لگا کر خاموش ہو گئے۔ تو کہیں مولانا عبدالباری صاحب کا یہ جدید طرزِ نگارش اسی قسم کے تاثر کا تو نتیجہ نہیں ہے؟

بہر حال کتاب بہت قابلِ قدر، دقیع، فکر انگیز اور لائقِ مطالعہ ہے۔ فجزاہ اللہ جزاءً خیرا۔

جہانگیری نصیحت نامہ۔ بقیہ صـ۱۹

اعتبار سے خرچ کرو۔ نامعقول کاموں[65] سے دور رہو۔ پہلے نئے درخت[66] لگاؤ اس کے بعد پرانے درخت کھودو۔ اپنی چادر[67] کے موافق پیر پھیلاؤ۔ بری صحبت[68] میں نہ بیٹھو تاکہ بدنام نہ ہو۔ بے وقوف، ناداں، دیوانہ اور مست کو نصیحت مت کرو۔ بلکہ ماننے اور سننے والوں کو نصیحت کرو۔ ماں باپ[69] کے حق کو ہمیشہ ملحوظ رکھو اور اس کو ادا کرو۔ نامردوں[70] اور کمینوں سے دوستی نہ کرو۔ لوگوں[71] کے مال پر طمع کی نظر نہ رکھو۔ شراب[72] اور کھانا تنہا نہ کھاؤ۔ جوانی[73] میں ہی بڑھاپے پر نظر رکھو اور بڑھاپے کا کام جوانی میں ہی ٹھیک کر لو۔ جھوٹی[74] قسم نہ کھاؤ۔ اس[75] دنیا کو آخرت پر قربان کر دو۔ اسلام کی پیروی میں کوتاہی نہ کرو تاکہ نجات ملے۔

"والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ"

مندرجہ بالا عربی دعائیہ جملہ پر نصیحت نامہ ختم ہے۔